دسمبر ۱۹۶۵ء

ابوحیان توحیدیؒ کے تنقیدی افکار

(کتاب المقابسات کی روشنی میں)

جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے، بی ٹی، ایچ (علیگ)

(لکچرر شعبۂ عربی وینکٹیشور یونیورسٹی آندھرا پردیش)

اگرچہ ابوحیان توحیدی کی شہرت بحیثیتِ ناقد کے نہیں ہے مگر اس کی کتاب "المقابسات" کے مطالعہ سے مجھے محسوس ہوا کہ اس عظیم مفکر کے چند تنقیدی افکار تو اتنے بلند پایہ ہیں کہ ان کی مثال بعد کے ناقدوں کی کتابوں میں بھی نہیں ملتی، اس کی عظمت اس بناء پر اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ نظریاتی طرزِ فکر کو جنم دے سکا، جس تک بعد کے لوگ بھی نہ پہونچ سکے، تیسری صدی ہجری عربی تنقید کا ابتدائی دور ہے، اور اس دور میں وہ بحیثیتِ ایک مستقل فن کے سامنے آتی ہے۔ ابوحیان توحیدی کا سنہ وفات ۴۰۰ھ ہے۔[1] اس طرح وہ چوتھی صدی ہی میں عام ناقدوں سے ہٹ کر بلندی کے ساتھ بعض اہم ادبی تنقید کے مسائل سے تعرض کرتا ہے، اگرچہ یہ مسائل بہت محدود ہیں ان کی تعداد چار، پانچ موضوعات سے آگے نہیں بڑھتی۔

یہاں ایک بات اور واضح کر دینی ضروری ہے کہ ابوحیان توحیدی کا موضوع تنقید نہیں تھا اور نہ اس نے اپنی کسی کتاب کا موضوع ادبی تنقید بنایا بلکہ جو خیالات اس کے میں پیش کر رہا ہوں وہ اس کی کتاب "المقابسات" میں ضمناً آگئے ہیں۔ ورنہ پوری کتاب فلسفہ، تصوف، کلام اور منطقیانہ بحثوں سے پُر ہے۔ لیکن اس میں جتنی بھی بحثیں ہیں وہ فکر و نظر کیلئے سرمایۂ روشنی فراہم کرتی ہیں، ذہن و عقل کو جلا بھی دیتی ہیں اور صیقل کر کے فکر پہ آمادہ بھی کرتی ہیں۔

ابوحیان توحیدی نے شاعری کی افادیت کو بڑے عمیق فکر سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ منتہائے شعر

---

[1] بعض مؤرخین نے توحیدی کی وفات ۴۱۳ھ بھی بتائی ہے۔

نفسِ شاعر سے عبارت ہے جو اس کے ذوق و قریحہ پر وارد ہوتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے اپنے سینہ میں ایک تلاطم، اور دل میں تموج کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ یہ تموج و تلاطم الفاظ، وزن اور بحر کے قالب میں ذوق کی مدد سے ڈھلتا ہے اور حسب ضرورت غزل، ہجو اور مدح کے لحاظ سے ترتیب پاتا ہے۔ شاعر کی طبیعت اور ذوق کو شعر کی بلندی، ضرب المثل اور تشبیہ کے استعمال، بحروں کے تصرفات اور قوافی کے انتخاب میں دخل ہوتا ہے۔ شعر کا حاصل سامنے ہوتا ہے چھپایا نہیں جاسکتا۔ اس کا نفع عام ہوتا ہے۔[1]

ایک دوسرے موقع پر وہ علمِ بلاغت کی تعریف بڑے اچھے انداز سے کرتا ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ناقد اس پورے ماحول کو پیش کرنا چاہتا ہے ہر بلیغ عبارت جس کی حامل ہوتی ہے۔ صاحبِ فن اس حقیقت سے خوب واقف ہوتا ہے کہ اس کا منتہا کیا ہے؟ اور کہاں اسے توقف کی ضرورت ہے؟ الفاظ کی خوش نمائی، مقاصد کی پاکیزگی، رمز و اشارے کے مواقع، وضاحت و تفصیل کی جگہیں، دلائل کی روشنی، قول کی لطافت، فکر کی نفاست طوالت کا حسن اور اختصار کی عمدگی، حسرت و مسرت کا حسب موقع استعمال اور اس طرز کی بہت سی باتیں ہیں جو ادیب و شاعر کو بلاغت کے زیور سے آراستہ کردیتی ہیں۔[2]

شعر و ادب کے سلسلہ میں ابوحیان توحیدی ایک بنیادی سوال اُٹھاتا ہے اور پھر اس کا خود ہی جواب دیتا ہے۔ انسانی زندگی میں شعر و ادب کا کیا مقام ہے؟ کیا زندگی اس کے بغیر ممکن ہے؟ ذرا سوچئے کہ یہ سوال اس نے اب سے ایک ہزار سال قبل اٹھایا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ہاں یہ علوم انسان کے لئے غیر معمولی نفع کا باعث ہیں، علومِ لسان اور بلاغت کا فائدہ انجنیرنگ اور علم ہیئت سے کم نہیں[3] میں نے "الہندسہ" کا ترجمہ انجنیرنگ کیا ہے، یہ لفظ جدید عربی میں انجنیرنگ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور انجنیر کو "مہندس" کہا جاتا ہے۔

ابوحیان نے ایک جگہ یہ بتایا ہے کہ طوالتِ کلام اور طوالتِ تحریر میں دو بڑے عیوب موجود ہیں، ایک اس سے فائدۂ کلام ختم ہوجاتا ہے اور دوسرے قاری یا سامع کی عقل پیچیدگی کا شکار ہوجاتی ہے۔[4]

ایک بحث میں وہ ایک بہت اہم اور دلچسپ رائے کا اظہار کرتا ہے۔ ابوحیان کا خیال ہے کہ حروف اور

---

[1] کتاب المقابسات۔ مؤلفہ ابوحیان توحیدی متوفی ۴۰۰ھ مطبوعہ بمبئی ص ۴۔ [2] ایضاً۔ ص ۵۔
[3] " ص ۵۔ [4] ایضاً ص ۳۱۔

کلمات کا اثر انسانی نفوس پر براہِ راست ہوتا ہے۔ ہر حرف انسانی طبائع پر ایک خط کی طرح کھنچ جاتا ہے۔ یہ خطوط جتنے مکمل وحسین ہوتے ہیں اتنا ہی حسین اثر بھی ان کے ذریعے سے آسانی طبائع پر مرتب ہوتا ہے، ان کلمات وحروف کا اصل عمل نفسِ انسانی میں تحریک کو جنم دیتا ہے۔ یہ محرکات ہیں جو اپنی قوت، بساط اور حسن کے لحاظ سے انسان پر پورا اثر کرتے ہیں کلمات جتنے خوبصورت ہوں گے ان کے ذریعہ پیدا ہونے والی تحریک بھی اتنی ہی لطیف ہوگی، اور اس طرح وہ ادراک جو ان کے ذریعہ سے حاصل ہوگا وہ اعلیٰ و اشرف ہوگا۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی بناء پر ایک بیان دوسرے بیان سے پُرکیف سمجھا جاتا ہے اور ایک کلام کو دوسرے کلام پر ترجیح دی جاتی ہے۔[1]

ادیب یا شاعر جب کوئی تخلیقی عمل شروع کرتا ہے تو اس کا مبدأ فیاض ہی اس کو اس میں مددگار بن کر انتہائے کمال کی جانب لے جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک تخلیقی عمل جو پہلے شروع کیا گیا تھا ایک دوسرے فنکار نے بعد میں اس پر اپنے کام کی بنیاد رکھی تو یہ بھی اس کے لئے ایک مبدأ ثابت ہوا اور تخلیق کی تکمیل کے بعد دونوں تخلیقی قطعات میں مشابہت باقی نہیں رہی۔[2]

یہاں ابوحیان نے یہ امر مبہم رکھا کہ کیوں دونوں تخلیقوں میں مشابہت ختم ہوجاتی ہے جبکہ ایک کی حیثیت موجد کی ہے اور دوسرے کی متبع کی، شاید اس کے ذہن میں یہ حقیقت کارفرما رہی ہو کہ دوسرے کی ذہنی ثقافت اور اس کے اپنے مبدأ فیاض کے اثرات ومحرکات اس طرزِ فکر کا ڈھانچہ تبدیل کردیتے ہوں جو دوسرے کے یہاں سے اُس نے اخذ کیا ہے

ابتداء میں فنکار کے بارے میں مختلف تنقیدی سوالات کثرت سے اُٹھتے ہیں، خطیب، شاعر اور فنکار کے بارے میں ناقدینِ فن وادب انھیں اپنے مشوروں سے نوازتے ہیں، عبارت میں کہیں خلل ہوتا ہے۔ نظم میں کہیں کمزوری پائی جاتی ہے۔ اور کہیں الفاظ کا استعمال اس موقع پر کلام کے شایانِ شان نہیں ہوتا تو ناقد فنکار کو الفاظ کے بدلنے یا معنی کی تبدیل کرنے کا مشورہ دیتا ہے، ابتدائے امر میں تو یہ بات یقیناً اس پر گراں ہوتی ہے، مگر مزاولت وتمرین کے بعد اس کو اپنے اعلیٰ فنی وتخلیقی عمل جنم دینے میں اور پھر اس میں تبدیلیاں پیدا کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔[3]

حسن وقبح میں کلام باہم بہت متفاوت ہوتا ہے، کبھی ایسا پست ہوتا ہے کہ نہ تو نفسِ انسانی پر اثر کرتا ہے

---

[1] کتاب المقابسات ص ۱۰۔ [2] ایضاً ص ۱۴۔ [3] ایضاً ص ۱۴۔

اور نہ دل پر اس سے کوئی تحریک رونما ہوتی ہے مگر قوی کلام طبیعتِ انسانی پر غیر معمولی اثر ڈالتا ہے اور قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔[1]

نظم کا میدانِ عمل طبائعِ انسانی ہیں، نثر کی سلطنت عقلِ انسانی ہے۔ ہم نے نظم کو نثر کے مقابلہ میں زیادہ قبول کیا ہے، اس لئے کہ طبیعت وزن وحسن کی طالب ہے اور عقل معنی کی طلب گار ہے۔[2]

یہاں ایک امر قابلِ لحاظ ہے کہ ابوحیان توحیدی کی نظر میں عربوں کی شاعری کا پس منظر تھا اور اسی پس منظر میں وہ یہ طرزِ فکر اختیار کرتا ہے مگر اس کی ذہانت وعظمت کا اعتراف اس کی ایک دوسری رائے کی بنا پر اس مسئلہ میں کرنا پڑتا ہے، وہ ایک دوسرے "مقابسہ" میں رقمطراز ہے کہ نثر جوہر کے اعتبار سے زیادہ بلند ہے اور نظم عرض کی حیثیت سے، لہٰذا نظم کا مرتبہ نثر سے کم ہے اس لئے کہ اوّلیت پہلے کو حاصل ہے اور دوسرے کا نمبر بعد میں آتا ہے۔[3]

یہاں ان خیالات کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، ان سے ناظرین کو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ناقد ابوحیان توحیدی نے مرتب ومنظم شکل میں اپنے تنقیدی افکار کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ یہ شذراتِ فکر اس کے مختلف "مقابسات" کے درمیان سے موتی سمجھ کر چن لئے گئے ہیں اور ان میں زیادہ تر ایسے اعلیٰ افکار ہیں جن کی مثال عرب ناقدوں کی کتابوں میں نہیں ملتی۔ اس نے بلاشبہ ان مسائلِ تنقید سے تعرض نہیں کیا ہے جو ہم کو ابن قتیبہ، جاحظ، ابن سلام، ثعلب، ابن المعتز، صولی، عسکری، ابن رشیق اور عبدالقاہر جرجانی کے یہاں ملتے ہیں۔ مگر اس کے طرز سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا اندازِ نظر بالکل الگ ہے اور وہ فکری طور سے مسائل کی اصل وبنیاد تک پہونچنا چاہتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کے ان افکار کا مطالعہ بھی کرنا چاہئے۔

چوتھی ہی صدی ہجری کا ایک عرب ناقد قدامہ بن جعفر بلاشبہ نظریاتی تنقید میں نہ صرف قابلِ قدر اضافہ کرتا ہے بلکہ اس کو فکر وفن کی اعلیٰ بلندی تک پہونچا دیتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے توحیدی کا موازنہ کرنا نامناسب نہیں کہ اس کا موضوع۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ تنقید نہ تھا۔

---

[1] المقابسات ص ۵۷۔ [2] ایضاً ص ۵۱۔ [3] ایضاً ص ۵۷۔ ۵۸۔